قال اللہ وقال الرسولؐ ہی نہیں اس کی بھی ایک متعین صورت یعنی مسلک حنفی کے سب کے سب یکساں شیدائی ہیں۔ عقل کا مصرف ان سب کے نزدیک بس ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ قرآن وسنت کا معروضی (OBJECTIVE) مطالعہ کرے اور زیادہ سے زیادہ یہ کہ شریعت کے اوامرونواہی کے اسرار وحکم کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ اور سب سے بڑا علمی مشغلہ ان کے نزدیک یہ ہے کہ اشعری وماتریدی عقائد اور فقہ حنفی کے لئے کچھ بس پڑ سکے تو عقلی بھی ورنہ زیادہ تر نقلی دلائل فراہم کیے جائیں...... دوسری طرف جدید علوم وفنون سے یہ بالکل کورے ہیں۔ جدید سائنس کی انہیں ہوا تک نہیں لگی اور طبیعات' کیمیا' فلکیات' حیاتیات اور نفسیات کے میدان میں انسان نے اپنے مشاہدے اور تجربے سے جو عظیم علمی ذخیرہ پچھلی دو تین صدیوں میں فراہم کیا ہے اس کے بارے میں ان کی معلومات زیادہ سے زیادہ کچھ سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہیں۔ فلسفہ ومنطق کے جدید رجحانات کا انہیں براہ راست کوئی علم نہیں۔ جدید عمرانیات اور خصوصاً سیاسیات اور معاشیات کی پیچیدگیوں اور الجھنوں کا بھی بلاواسطہ علم انہیں حاصل نہیں...... گویا کہ یہ پورا حلقہ ذہنی وفکری اعتبار سے خالصتاً آج سے سات آٹھ سو برس قبل کی دنیا میں رہ رہا ہے اور خواہ ان میں کچھ حضرات اپنی تحریر وتقریر میں کچھ سنی سنائی جدید اصطلاحات بھی استعمال کر لیتے ہوں واقعہ یہ ہے کہ جدید دنیا کا نہ انہوں نے قریب سے مشاہدہ کیا ہے نہ براہ راست مطالعہ۔

نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا جسد ملی اس وقت دو بالکل متضاد حصوں میں منقسم ہے اور اس بحر محیط میں دو رو ئیں بالکل پہلو بہ پہلو لیکن قطعاً علیحدہ علیحدہ بعینہٖ اسی کیفیت کے ساتھ چلی جارہی ہیں جس کا نقشہ سورہ رحمٰن کی ان آیات میں کھینچا گیا ہے کہ!

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ	چلائے دو دریا کہ باہم ملے ہوئے (بھی) ہیں (اور) ان کے مابین ایک حجاب (بھی) ہے (جس سے) تجاوز نہیں کر سکتے۔

ان دو متضاد فکری وتہذیبی سورتوں کا سب سے بڑا مظہر دو مختلف نظام ہائے تعلیم ہیں جن میں سے ایک علی گڑھ کا معنوی تسلسل ہے اور دوسرا دیوبند کا اور پوری ملت دو نمایاں طور پر

مختلف مکاتب فکر و نقطہ ہائے نظر کے مابین بٹی ہوئی ہے۔ دونوں کا ایک ایک پہلو مفید و روشن ہے اور ایک ایک مضر اور مایوس کن..... ایک جانب جدید علوم و فنون اور سائنس و ٹیکنالوجی ہے لیکن ملحدانہ طرز فکر اور مادہ پرستانہ نقطہ نظر کے ساتھ اور دوسری طرف ایمان و اسلام ہے لیکن جمود و مطلق اور فرسودہ و از کار رفتہ فلسفہ و منطق کے ساتھ۔ ان دونوں مکاتب فکر کو علیحدہ علیحدہ پروان چڑھتے پوری ایک صدی بیت گئی ہے..... اور واقعہ یہ ہے کہ اس دور کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ تاحال ان کے مابین امتزاج کی کوئی موثر صورت پیدا نہیں ہو سکی۔ اس کے برعکس ان کے مابین ایک مسلسل کشمکش جاری ہے جو اکثر و بیشتر تو خاموش آویزش اور سرد جنگ تک ہی محدود رہتی ہے لیکن کبھی کبھی گرجدار تصادم کی صورت بھی اختیار کر لیتی ہے اور غالباً ملت اسلامی کی اس وقت کی سب سے بڑی بدقسمتی یہی ہے کہ اس "آویزش" میں کسی واقعی و حقیقی "آمیزش" کا رنگ تاحال پیدا نہیں کیا جا سکا۔

☆ ☆ ☆

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ

اپنی تالیف **وحدتِ اُمت** میں اگر

○ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور مولانا سید انور شاہ کاشمیریؒ
کے دو ایمان افروز اور سبق آموز واقعات کے سوا اور کچھ نہ لکھتے
تب بھی یہ کتاب موتیوں میں تُلنے کی مستحق ہوتی

وقت کے اہم ترین موضوع پر اس بہترین اور مفید ترین کتاب کو
اب مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور نے شایانِ شان طور پر شائع کیا ہے۔

بڑے سائز کے ۵۲ صفحات ○ عمدہ دبیز کاغذ ○ دیدہ زیب کور

ہدیہ: ۴ روپے ○ علاوہ محصولڈاک

علی گڑھ اور دیوبند کی دو انتہاؤں کے مابین

چند درمیانی راہیں

یوں تو ایک عظیم ملت میں فکر و نظر کے صد ہا رنگوں (SHADES) کا پایا جانا ایک فطری اور قدرتی امر ہے، چنانچہ ہماری قوم میں بھی سوچنے کے لاتعداد انداز اور غور و فکر کے بے شمار طور طریقے پائے جاتے ہیں۔ تاہم ذرا دقّت نظر سے دیکھا جائے تو صاف نظر آ جاتا ہے کہ فکر و نظر کے ان لاتعداد رنگوں میں اصل اور پختہ رنگ دو ہی ہیں۔ ایک علی گڑھ کا دوسرا دیوبند کا۔ بقیہ تمام رنگ جو ان کے مابین یا ان کے ارد گرد پائے جاتے ہیں سب ان کے امتزاج ہی سے وجود میں آئے ہیں اور ان میں سے کسی میں علی گڑھ کا رنگ زیادہ نمایاں ہے اور کسی میں دیوبند کا[1]......... گویا کہ ہماری ملت کے بحر محیط کی اصل دو روئیں یہی ہیں جو تقریباً ایک سو سال سے مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیٰنِ ○ کی طرح بالکل ملحق اور متصل لیکن بَیْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیٰنِ ○ کی سی علیحدگی اور لاتعلقی کے ساتھ مسلسل چلی آ رہی ہیں.......... ان میں سے ہر ایک کا ایک مستقل ماضی اور متعین فکری اساس ہے، اور چونکہ ان میں سے ہر ایک کی پشت پر ایک وسیع و عریض اور پختہ و محکم نظام تعلیم بھی موجود ہے، لہٰذا ان دونوں کے اثرات نہایت دور رس ہیں اور ان کی جڑیں ہمارے جسد ملی میں بہت گہری اتری ہوئی ہیں۔ گویا کہ یہ دونوں مکاتب فکر ہماری قومی و ملی زندگی میں "اَصْلُهَا ثَابِتٌ" کی سی محکم اساس اور "وَفَرْعُهَا فِی السَّمَاءِ ○ کا سا ہمہ گیر اثر و نفوذ رکھتے ہیں۔

---

[1] کیا اللہ کی شان ہے کہ ملّتِ اسلامیہ پاکستان کے ان دونوں دینی و مذہبی اور تہذیبی و ثقافتی سوتوں کے اصل منبعے ہندوستان ہی میں رہ گئے.......... اور یہی نہیں بلکہ جیسا کہ بعد میں واضح ہو گا، ان دونوں کے مابین امتزاج کی جتنی کوششیں ہوئیں ان سب کے اصل مراکز بھی وہیں رہ گئے۔

ان میں سے علی گڑھ کی ''مذہبی عقلیت'' جسے جسٹس امیر علی' سرسید احمد خاں اور مولوی چراغ علی وغیرہم نے مرتب کیا تھا اس کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں' ساتھ ہی اس کے مقابلے میں دیو بند جس کی بنیاد مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ہاتھوں پڑی اور جن کے ذریعے اس میں کتاب و سنت کا علم ہی نہیں بلکہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی روحانیت بھی سرایت کر گئی تھی' جس طرح قال اللہ اور قال الرسولؐ کا حصار اور دین و مذہب کے ''نقل'' کے دفاع کا مرکز بنا' اس کی تفصیل بھی ہم بیان کر چکے ہیں.......... اور دونوں کے ''مذہبی فکر' کے مابین جو بُعد المشرقین پایا جاتا ہے اس کا تذکرہ بھی تفصیل کے ساتھ ہو چکا ہے.......... لیکن اس کے بارے میں گمان درست نہ ہو گا کہ یہ بُعد ہمیشہ' ہر حال اور ہر صورت میں موجود رہا۔ اس کے برعکس' واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں سے بعض ایسی شخصیتیں بھی ابھریں جو اپنے اصل مکتب فکر کے مجموعی مزاج کی بالکل ضد ثابت ہوئیں۔ چنانچہ ''حسن از بصرہ' بلالؓ از حبش' صہیبؓ از روم'' کے مصداق سرزمین علی گڑھ سے بھی بہت سے راسخ العقیدہ' دردمند' ذہناً مسلم اور قلباً مومن لوگ اٹھے جن میں سے ایک مولانا محمد علی جوہر کی مثال ہی اتنی درخشاں و تابناک ہے کہ مزید کی کوئی حاجت نہیں۔ [۱] دوسری طرف خاک دیوبند سے مولانا عبید اللہ سندھی ایسی متجددانہ مزاج رکھنے والی شخصیت بھی ابھری جنہوں نے جدید دنیا کا مطالعہ ہی نہیں بھرپور مشاہدہ بھی کیا۔ اور جدید رجحانات کے زیر اثر ملت اسلامیہ کے لئے تمدن و معاشرت اور معیشت و سیاست کے میدانوں میں ایسی راہیں تجویز کیں جن کے لئے اسناد دیوبند کے موجود الوقت مقلدانہ ماحول سے نہیں بلکہ صرف امام الہند شاہ ولی اللہ الدہلوی کے فلسفہ ارتفاقات ہی سے مل سکتا تھا!.......... تاہم یہ مثالیں محض استثنائی ہیں اور ایک انگریزی [۲] مثل کے مطابق' ان سے وہ کلیہ مزید مستحکم ہوتا ہے' جو ہم نے بیان کیا تھا۔ یعنی یہ کہ علی گڑھ اور دیوبند کے مابین کم از کم بُعد المشرقین موجود ہے [۳]

---

[۱] خود علامہ اقبالؒ جن کا تذکرہ بعد میں تفصیل سے آئے گا بہرحال اسی شاخ سے متعلق ہیں۔

[۲] EXCEPTIONS PROVE THE RULE !

[۳] یہ بُعد صرف مذہبی تصورات اور دینی فکر کے میدان تک ہی محدود نہ رہا بلکہ جیسا کہ ہم تفصیل سے عرض کر چکے ہیں ، اس بُعد سے ملی و قومی سیاست بھی بری طرح متاثر ہوئی اور اس میدان میں بھی ان دونوں کے رخ بالکل متضاد سمتوں میں مڑ گئے۔

اس بُعد کا احساس بھی بالکل شروع ہی سے ہو گیا تھا اور اس فاصلے کو کم کرنے اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے قریب ترلانے کی ضرورت بھی بالکل ابتداء ہی سے محسوس کی جانے لگی تھی.......... چنانچہ ان کے مابین امتزاج اور ارتباط کی کوششوں کا سراغ بھی بالکل ابتداء ہی سے ملتا ہے۔ ندوۃ العلماء کا قیام ان کوششوں کا مظہر اول تھا.......... اور دہلی میں جمعیت الانصار اور جامعہ ملیہ کا قیام مظہر ثانی پھر ان ہی کوششوں کا ایک تیسرا مرکز جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن بنا اور اس نے بھی جدید وقدیم کو قریب لانے میں ایک اہم رول ادا کیا۔

ندوہ کے بارے میں یہ بات بالکل صحیح ہے کہ وہ علی گڑھ کی کوکھ سے بر آمد ہوا۔ مولانا شبلی نعمانی مرحوم جو پہلے علی گڑھ کے پروفیسر شبلی تھے اور بعد میں ندوہ کے علامہ شبلی بنے 'ابتداءً سر سید مرحوم کے رفقاء اور اعوان و انصار میں سے تھے۔ جو بعد میں ان سے بدظن اور ان کی تعلیمی سکیم سے غیر مطمئن ہو کر ان سے علیحدہ ہوئے۔ ہمیں یہاں ان اسباب سے کوئی بحث نہیں جن کی بنا پر یہ علیحدگی واقع ہوئی۔ ہمیں بحث قیام ندوہ کے صرف اس پہلو سے ہے کہ یہ قدیم و جدید.......... اور تجدد و جمود کے مابین ایک متوازن علمی وفکری راہ پیدا کرنے کی سعی کا سب سے پہلا اور ہر اعتبار سے اہم ترین مظہر ہے۔

لیکن.......... یہ ایک واقعہ ہے کہ ندوہ فکر و نظر کا مرکز بننے کی بجائے صرف عربی زبان و ادب کا ایک گہوارہ اور تاریخ اسلامی کا ایک دارالاشاعت بن کر رہ گیا۔ اور علی گڑھ کے جدید اور دیوبند کے قدیم مذہبی فکر کے مابین کوئی حقیقی اور واقعی امتزاج پیدا کرنے میں بالکل ناکام رہا..........!

ایک جدید لیکن متوازن "علم کلام" کی تدوین کی ضرورت کا احساس تو مولانا شبلی کو شدت کے ساتھ تھا۔ چنانچہ اسی لئے پہلے انہوں نے "علم الکلام" میں قدیم علم کلام کی تاریخ مرتب کی اور پھر نیا علم کلام "الکلام" کے نام سے لکھنا شروع کیا.......... لیکن ایک تو وہ اس کی صرف ایک جلد لکھ کر رہ گئے حالانکہ اس کی تکمیل ان کے پیش نظر سکیم کے مطابق تین جلدوں میں ہونی تھی[1]۔ اور دوسرے یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے

---

[1] غالباً اس لئے کہ اس پہلی ہی جلد پر جو مخالفت ہوئی اور کفر کے فتوے موصول ہوئے۔ وہی مولانا شبلی کے لئے بہت کافی تھے۔

کہ وہ وقت کے تقاضے کو بھی بالکل نہ سمجھ پائے۔ اور جو "علم کلام" اس وقت حقیقتاً مطلوب تھا اس کے فروغ کے اصول بھی ان پر واضح نہ ہو سکے!

جن دو انتہاؤں کے مابین مولانا شبلی ایک متوازن راہ نکالنا چاہتے تھے ان کا تذکرہ خود ان کے الفاظ میں سنئے۔

"حال ہی میں علم کلام کے متعلق مصر، شام اور ہندوستان میں متعدد کتابیں تصنیف کی گئی ہیں اور نئے علم کلام کا ایک دفتر تیار ہو گیا ہے۔ لیکن یہ نیا علم کلام دو قسم کا ہے یا تو وہی فرسودہ اور دوراز کار مسائل و دلائل ہیں جو متاخرین اشاعرہ نے ایجاد کئے تھے [1] یا یہ کیا ہے کہ یورپ کے ہر قسم کے معتقدات اور خیالات کو حق کا معیار قرار دیا ہے اور پھر قرآن و حدیث کو زبردستی کھینچ تان کر ان سے ملا دیا ہے [2] .... پہلا کورانہ تقلید ہے اور دوسرا تقلیدی اجتہاد [3] ......" (علم الکلام۔ تمہید)

ان دونوں کو رد کر کے جس تیسرے علم کلام کی ضرورت ہے اس کے ضمن میں "جدید تعلیم یافتہ گروہ" کا نقطہ نظر مولانا نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

"ہر طرف سے صدائیں آ رہی ہیں کہ پھر ایک نئے علم کلام کی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کو سب نے تسلیم کر لیا ہے لیکن اصول کی نسبت اختلاف ہے۔ جدید تعلیم یافتہ گروہ کہتا ہے کہ نیا علم کلام بالکل نئے اصول پر قائم کرنا ہو گا۔ کیونکہ پہلے زمانے میں جس قسم کے اعتراضات اسلام پر کئے جاتے تھے، آج ان کی نوعیت بالکل بدل گئی ہے۔ پہلے زمانے میں یونان کے فلسفے کا مقابلہ تھا جو محض قیاسات اور مظنونات پر قائم تھا۔ آج بدیہیات اور تجربہ کا سامنا ہے اس لئے اس کے مقابلے میں محض قیاسات عقلی اور احتمال آفرینیوں سے کام نہیں چل سکتا" (ایضاً)

لیکن کمال سادگی کے ساتھ اس رائے کو محض یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ۔

"لیکن ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں۔ قدیم علم کلام کا جو حصہ آج بیکار ہے پہلے بھی ناکافی تھا۔ اور جو حصہ اس وقت کار آمد تھا آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ کیونکہ کسی شے کی صحت

---

[1] یہ صاف اشارہ ہے حلقہ دیوبند کی نئی کلامی تصنیفات کی جانب جیسے مثلاً مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی "حجتہ الاسلام"!

[2] مراد ہے سرسید احمد خان اور مولوی چراغ علی کا علمِ کلام

[3] مولانا کا یہ طرزِ تعبیر یقیناً بہت قابلِ داد ہے۔

اور واقعیت زمانہ کی امتداد و انقلاب سے نہیں بدلتی۔ اس بنا پر مدت سے میرا ارادہ ہے کہ علم کلام کو قدیم اصول اور موجودہ مذاق کے موافق مرتب کیا جائے...... " (ایضاً)

چنانچہ جو کچھ انہوں نے کیا وہ یہی تھا کہ قدیم علم کلام کو نئے اسلوب' نئے پیرایہ بیان اور نئے انداز میں گویا کہ نئے "مذاق" کے مطابق پیش کر دیا۔

لیکن اصل مسئلے کے فہم کی کوتاہی میں مولانا شبلی غالباً بالکل معذور ہیں۔ اس لئے کہ ایک تو ان کے زمانے تک جدید فلسفے اور سائنس کا ادغام نہیں ہوا تھا۔ دوسرے خود فلسفہ بھی ابھی صرف سپنسر اور مل[1] تک ہی پہنچا تھا۔ گویا کہ فکر جدید کا اصل چیلنج ابھی پوری طرح سامنے نہیں آیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ "الکلام" کے مقدمے میں مولانا نے فلسفہ و سائنس کی موجود الوقت صورت حال کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

"تمام دنیا میں ایک غل مچ گیا ہے کہ علوم جدیدہ اور فلسفہ جدیدہ نے مذہب کی بنیاد متزلزل کر دی ہے۔ فلسفہ و مذہب کے معرکے میں ہمیشہ اس قسم کی صدائیں بلند ہوتی رہی ہیں اور اس لحاظ سے یہ کوئی نیا واقعہ نہیں۔ لیکن آج یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ فلسفہ قدیمہ قیاسات اور ظنّیات پر مبنی تھا اس لئے وہ مذہب کا استیصال نہ کر سکا۔ بر خلاف اس کے فلسفہ جدیدہ تمام تر تجربہ اور مشاہدہ پر مبنی ہے۔ اس لئے مذہب کسی طرح اس کے مقابلے میں جانبر نہیں ہو سکتا............ یہ ایک عام صدا ہے جو یورپ سے اٹھ کر تمام دنیا میں گونج اٹھی ہے لیکن ہم کو غور سے دیکھنا چاہئے کہ اس واقعیت میں مغالطہ کا کس قدر حصہ شامل ہو گیا ہے۔

یونان میں فلسفہ ایک مجموعہ کا نام تھا جس میں طبعیات' عنصریات' فلکیات' الہیات' ما بعد الطبعیات سب شامل تھا۔ لیکن یورپ نے نہایت صحیح اصول پر اس کے دو حصے کر دیئے جو مسائل مشاہدہ تجربہ کی بناء پر قطعی اور یقینی ثابت ہو گئے ان کو سائنس کا لقب دیا اور جو مسائل تجربہ و مشاہدہ کی دسترس سے باہر تھے ان کا نام فلسفہ رکھا!"

لیکن افسوس کہ یورپ میں یہ "نہایت صحیح اصول" بس تھوڑی دیر ہی چل سکا اور جلد ہی اس کے بجائے وہ "فطری اصول" پھر بروئے کار آ گیا کہ علم ایک نا قابل تقسیم وحدت ہے' اور اسے سائنس اور فلسفے کے دو جداگانہ خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ یورپ کا بعد

---

[1] بقول اکبر الہ آبادی مرحوم۔

غزالی و رومی کی بھلا کون سنے گا!
محفل میں چھڑا نغمۂ اسپنسرو مل ہے!

کا فلسفہ ان نظریات کی اساسات پر مرتب و مدوّن ہوا جو سائنس کے بعض شعبوں سے ابھرے جیسے مثلاً ڈارون کا نظریہ ارتقاء اور فرائڈ کا نظریہ جنس وغیرہ۔

الغرض جدید دنیا کو جو نیا علم کلام فی الواقع مطلوب تھا۔ اس کے تو اصول و اساسات کے بارے میں بھی مولانا شبلی صحیح تصور قائم نہ کر پائے تو اس کی تدوین کیا کرتے۔ رہا دوسرے معاملات میں علی گڑھ اور دیوبند کے مابین امتزاج تو اس کی بھی کوئی صورت ندوہ میں پیدا نہ ہو سکی......... اور مولانا شبلی کے بعد ان کے جانشین مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے جب حلقہ دیوبند کی ایک علمی و روحانی شخصیت یعنی مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تو یہ بات بالکل ہی کھل گئی کہ ندوہ کوئی مستقل چیز ہے ہی نہیں۔ اس کی حیثیت بس ایک چھوٹی سی لہر کی ہے جو علی گڑھ کی عظیم رو سے نکل کر بالآخر دیوبند کی دوسری بڑی رو میں جا شامل ہوئی۔ بعد میں جب سید سلیمان ندوی کے شاگرد رشید سید ابوالحسن علی ندوی نے کچھ عرصہ ادھر ادھر کی خاک چھاننے کے بعد بالآخر اسی حلقہ دیوبند کی ایک دوسری روحانی شخصیت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تو یہ اسی سنت سلیمانی کا 'اتباع' ہے۔ بہر حال اب ندوہ کی حیثیت دیوبند کے ایک ضمیمے کی ہے یا زیادہ سے زیادہ ایک توسیع (EXTENSION) کی اس کا مستقل جداگانہ وجود کوئی نہیں!

اس طرح ندوہ تو بہت جلد ختم ہو گیا اور مولانا شبلی جو درمیانی راہ نکالنا چاہتے تھے وہ اس کے ذریعے سے نہ نکل سکی۔ تاہم ان کی یہ خواہش بعض دوسری پگڈنڈیوں کی صورت میں ظاہر ہوئی جن کا تذکرہ اہمیت کا حامل ہے۔

مولانا شبلی اپنی ذات میں ایک نہایت جامع الصفات انسان تھے اور ان کی شخصیت ندوہ کی نسبت بہت زیادہ جامع اور گھمبیر تھی چنانچہ وہ بیک وقت علم و فضل، فلسفہ و کلام، شعر و ادب اور ملّی و قومی سیاست حتیٰ کہ رندی و رنگینی سب کے جامع تھے۔ ان کے اصل جانشیں سید سلیمان ندوی مرحوم کی شخصیت میں مولانا شبلی کی شخصیت کے صرف چند ہی پہلوؤں کا تسلسل قائم رہ سکا لیکن ان کے زیر اثر دو اور ہستیاں ایسی پروان چڑھیں جو ان کی بعض دوسری صفات کی وارث بنیں اور جن میں مولانا شبلی کی شخصیت کے بعض دوسرے پہلو اجاگر ہوئے۔ ہماری مراد مولانا حمید الدین فراہی اور مولانا ابوالکلام آزاد سے ہے۔ یہ دونوں حضرات براہ راست

ندوی تو نہیں ہیں لیکن ان کی تربیت میں مولانا شبلی کا بڑا حصہ ہے........ اور چونکہ برصغیر کی حالیہ مذہبی فکر کے میدان میں علی گڑھ اور دیو بند کی دو انتہاؤں کے مابین دو اہم علمی و فکری سوتے ان ہستیوں کی بدولت پھوٹے ہیں لہٰذا ان کا کسی قدر تفصیلی تذکرہ ضروری ہے۔

مولانا فراہیؒ اور مولانا آزاد مرحوم میں متعدد امور بطور قدر مشترک بھی ہیں مثلاً ایک یہی کہ دونوں کی تربیت میں مولانا شبلی کا حصہ تھا۔ دوسرے یہ کہ دونوں کو قران حکیم سے خاص شغف تھا۔ تیسرے یہ کہ دونوں اپنے وقت کے انتہائی وضع دار انسان تھے چوتھے یہ کہ دونوں (مولانا شبلی کے بالکل برعکس........ جنہوں نے اپنی 'حنفیّت' کی شدت کے اظہار کے لئے 'نعمانی' کی نسبت کو اپنے نام کا مستقل جزو بنالیا تھا) تقلید سے یکساں بعید و بیزار تھے اور دونوں کو اصل ذہنی و علمی مناسبت امام ابن تیمیہؒ سے تھی........ لیکن ان اشتراکات کے بعد اختلافات کا ایک وسیع میدان ہے جس میں یہ دونوں شخصیتیں ایک دوسرے کی بالکل ضد تھیں مولانا آزاد میں شبلی کی رندی و رنگینی کا تسلسل بھی موجود رہا جبکہ مولانا فراہی بالکل زاہد خشک تھے' مولانا آزاد کی وضعداری میں شکوہ و تمکنت کی آمیزش تھی جبکہ مولانا فراہی پر فقر و درویشی کا رنگ غالب تھا' مولانا آزاد 'ابوالکلام تھے اور ان کی شعلہ بیان خطابت میں ایک لاوا اگلنے والے زندہ آتش فشاں کا رنگ تھا جبکہ مولانا فراہیؒ نہایت کم گو تھے اور ان کا سکوت ایک ایسے خاموش آتش فشاں سے مشابہت رکھتا تھا جس کے باطن میں تو خیالات و احساسات کا لاوا جوش مارتا ہوا ہو لیکن ظاہر میں وہ بالکل ساکت و صامت ہو۔ مولانا آزاد کی تحریر میں اصل زور ادبیت اور عبارت آرائی پر تھا جبکہ مولانا فراہی کی تحریر نہایت سادہ لیکن مدلل ہوتی تھی مولانا آزاد سیاست کے میدان کے بھی شہسوار تھے اور دین کی وادی میں بھی ان کا اصل مقام داعی کا تھا جبکہ مولانا فراہی سیاست سے تمام عمر کنارہ کش رہے اور دین و مذہب کے میدان میں بھی ان کا اصل مقام آخر دم تک صرف ایک طالب علم یا زیادہ سے زیادہ ایک مفکر کا رہا........ چنانچہ مولانا آزاد طوطی ہند تو تھے ہی ایک وقت ایسا بھی گزرا جب وہ 'امام الہند' قرار پائے جبکہ مولانا فراہی سے ان کی زندگی ہی میں نہیں بلکہ آج تک بھی صرف کچھ علم دوست لوگ ہی واقف ہو سکے........ لیکن اس کے برعکس مولانا آزاد تو آندھی کی مانند اٹھے اور بگولے کی طرح رخصت ہو گئے تا آنکہ آج وہ لوگ بھی ان کا نام لینا تک گوارا نہیں کرتے جنہوں نے اپنی قندیل خود ان ہی کی شمع سے روشن کی۔ جبکہ مولانا فراہی ایک

مستقل طرز فکر اور مکتب علمی کی بنیاد رکھ گئے جن کا نام لیوا ایک ادارہ "دائرہ حمیدیہ" کے نام سے ہندوستان میں اور ایک انجمن مولانا امین احسن اصلاحی کی ذات میں پاکستان میں موجود ہے۔

قران مجید سے جو شغف ان دونوں بزرگوں کو تھا، مزاج کے افتاد کے فرق کی بناء پر اس کا ظہور بھی مختلف صورتوں میں ہوا۔ مولانا آزاد کی تفسیر سورہ فاتحہ اردو ادب کا تو شاہکار (CLASSIC) ہے ہی قران کے جلال و جمال کا بھی ایک حسین مرقع ہے۔ پھر سورہ کہف کے بعض مباحث میں ان کی تحقیق و تدقیق کا تو کوئی جواب ہی نہیں، بایں ہمہ قرانِ حکیم کا کوئی مرتّب و منضبط فکر وہ پیش نہیں کر سکے۔ جبکہ مولانا فراہیؒ نے قرآنِ حکیم کے استدلالی پہلو کو واضح کیا۔ اور ایک طرف نظمِ قرآن کی اہمیت واضح کر کے تدبر قرآن کی نئی راہیں کھولیں اور قرآن پر غور و فکر کے اصول و قواعد از سرنو مرتب و مدون کئے اور دوسری طرف اپنی بعض تصنیفات میں (جو تا حال مسوّدات ہی کی صورت میں ہیں) خالصتاً قرآن حکیم کی روشنی میں ایک نئے علم کلام کی بنیاد رکھ دی.......... جیسا کہ ہم نے عرض کیا، آسمانِ شبلی کے ان "دو ٹوٹے ہوئے تاروں" سے برصغیر کی موجودہ اسلامی فکر کے دو سوتے پھوٹے ہیں جن کا تذکرہ صورتِ حال کے صحیح اور مکمل جائزے کے لئے ناگزیر ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

مولانا فراہیؒ .... کے علمی ورثے کے حامل مولانا امین احسن اصلاحی ہیں۔ جنہوں نے اپنی عملی زندگی کی ابتداء ان کے مشن کی تکمیل کے ارادے اور اس کے لئے عملی جدوجہد کے آغاز ہی سے کی تھی۔ چنانچہ تحصیلِ علم سے فراغت کے فوراً بعد انہوں نے ایک طرف مولانا فراہیؒ کی یادگار، مدرستہ الاصلاح اعظم گڑھ کو سنبھالا دوسری طرف دائرہ حمیدیہ قائم کیا تیسری طرف ۳۸ء میں ماہنامہ الاصلاح، جاری کیا جس کے ذریعے فکر فراہیؒ کی اشاعت شروع ہوئی۔ وقس علی ہذا.......... لیکن ابھی یہ تمام کام بالکل ابتدائی حالت میں تھے کہ حکیم فراہی کا یہ جانشین ابوالکلام کے معنوی خلیفہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کی "دعوت اسلامی" کی گھن گرج سے متاثر ہو کر رخت سفر باندھ ان کی خدمت

میں جاحاضر ہوا۔ اور ایک آدھا نہیں سترہ سال ان کی شخصیت کے پیچ و خم میں الجھا رہا[1]............ تا آنکہ پورے سترہ سال اس دشت کی بادیہ پیمائی کے بعد' آج سے دس سال قبل[2] جب آنکھ کھلی اور ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ ماضی بہت پیچھے رہ گیا دائرہ حمیدیہ اور فکرِ فراہیؒ کے تمام قدر دان ہندوستان میں رہ گئے۔ یہاں یکہ و تنہا' نہ کوئی رفیق نہ ہمراہ' نہ اسباب نہ وسائل' الغرض ع

"جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم تھا خزاں کا"

ان حالات میں مولانا امین احسن اصلاحی نے جس طرح پھر "جگر لخت لخت" کو جمع کیا اور از سر نو اپنے کام کی ابتدا کی واقعہ یہ ہے کہ یہ اس بڑھاپے کے عالم میں ان کی جواں ہمتی کی دلیل ہے............ بہرحال الاصلاح' کی جگہ میثاق کا اجراء ہوا جو قلت اعوان و انصار کی بناء پر کچھ ہچکولے کھاتی ہوئی کشتی کی مانند چلا اور پھر بند ہو گیا............ "حلقہ تدبر قرآن" قائم ہوا جس کے ذریعے چند نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع ہوا۔ لیکن کچھ عرصہ نہایت کامیابی سے چلنے کے بعد ان نوجوانوں کے ادھر ادھر منتشر ہو جانے کی بناء پر اس کا کام بھی بند ہو گیا[3]............ تا آنکہ آج سے ڈھائی سال قبل راقم الحروف' جس نے خود مولانا مودودی کی "تحریک اسلامی" ہی کی گود میں آنکھ کھولی تھی اور ان ہی کے واسطے سے مولانا اصلاحی سے متعارف ہوا تھا' لاہور منتقل ہوا اور اسے اللہ نے مولانا کے ان کاموں میں تعاون کی توفیق و

---

[1] اگر مولانا فراہیؒ زندہ ہوتے تو ہمیں یقین ہے کہ وہ سرمد کے ان الفاظ میں مولانا اصلاحی سے ضرور شکوہ کرتے۔

سرمد دردیں عجب شکستے کر دی
ایمان فدائے چشم مستے کر دی
عمرے کہ بآیات و احادیث گزشت
رفتی و نثار خود پرستے کر دی

(سرمد کی رباعی میں "خود پرستے" کی جگہ "بت پرستے" ہے جسے ہم نے موقع و محل کے لحاظ سے بدل کر مناسبِ حال کر دیا!)

[2] اس تحریر کو پڑھتے ہوئے یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ ۶۸ء میں لکھی گئی تھی!

[3] خدا کا شکر ہے کہ ایک عرصے کے بعد اب پھر یہ حلقہ سرگرم کار ہو گیا ہے۔

سعادت بخشی، تو اس کے فضل و کرم سے "میثاق" بھی از سر نو جاری ہوا۔ اور بحمد اللہ تا حال جاری ہے "تدبر قرآن" کی جلد اول بھی شائع ہوئی اور مولانا کے درس قرآن و حدیث کی ایک ہفتہ وار نشست کا سلسلہ بھی شروع ہوا جو بفضلہٖ تعالیٰ باقاعدگی سے جاری ہے۔

راقم الحروف کو مولانا اصلاحی سے براہ راست تلمّذ کا شرف تو حاصل نہیں تاہم یہ واقعہ ہے کہ قرآن حکیم سے کسی قدر ذہنی مناسبت اسے حاصل ہوئی ہے وہ مولانا ہی کی تحریروں کے مطالعے سے ہوئی ہے اور راقم کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا کو بھی عمر دراز اور صحت و فراغت عطا فرمائے تاکہ وہ اپنے استاد مولانا فراہی کے علمی ورثے کو مزید اضافوں کے ساتھ اگلی نسل کو منتقل کر سکیں ان کے شاگردوں کو بھی توفیق دے کہ وہ اس کام کے لئے اپنی زندگیوں کو وقف کرنے کا عزم کر سکیں اور راقم کو بھی اس نیک کام میں تعاون کی سعادت نصیب کئے رکھے! آمین۔

بہرحال فکرِ فراہیؒ اور سلسلہ تدبر قرآن علی گڑھ اور دیوبند کے درمیانی علمی و فکری سوتوں میں سے ایک ہے جو اپنی کمیت اور حلقہ اثر سے توفی الحال زیادہ اہم نہیں لیکن اپنے امکانات کے اعتبار سے یقیناً نہایت اہم ہے خصوصاً اس لئے کہ اس کی بنیاد بھی خالصتاً قرآن حکیم پر ہے اور اُس میں سارا استدلال بھی قرآن ہی سے کیا جاتا ہے اور تدبر قرآن کا جو خاص اسلوب و نہج اس کے ذریعے عام ہو رہا ہے اس سے انشاء اللہ حکمت قرآنی کے بہت سے نئے گوشے سامنے آئیں گے اور فکر انسانی کو نئی رہنمائی ملے گی.......... مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنی تصانیف 'حقیقت شرک' 'حقیقت توحید' اور حقیقت تقویٰ میں ایمان باللہ کے مختلف پہلوؤں سے جس انداز میں بحث کی ہے وہ اگرچہ باصطلاح معروف تو ھعلم کلام' نہیں لیکن خالص قرآنی علم کلام ضرور ہے اور اگر مولانا اپنی سکیم کے مطابق معاد اور رسالت پر بھی اسی انداز سے لکھ سکے تو اس طرح خالصتہ قرآن حکیم کی بنیاد پر ایک نئے علم کلام' کی ترتیب و تدوین کی راہ کھل جائے گی۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اگرچہ کبھی صراحۃً کیا کنایۃً بھی یہ تسلیم نہیں کیا۔

——— اور اُن کے مخصُوص مزاج اور اُفتادِ طبع کے پیشِ نظر اُن سے

اس کی توقع بھی عبث ہے...... کہ انہوں نے اپنی تحریک کے " اصول و مبادی مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سے اخذ کئے ہیں[ا] تاہم واقعہ یہی ہے کہ ۳۸۔ ۱۹۳۷ء کے لگ بھگ جب مسلمانان ہند کی قومی و ملّی سیاست کا ایک رخ متعین ہو گیا اور اس کی قیادت و سیادت میں انہیں کوئی مقام حاصل نہ ہو سکا تو انہوں نے کسی دوسری راہ پر سوچنا شروع کیا اور اس کے لئے انہیں سارا پکا پکایا اور بالکل تیار مواد مولانا ابوالکلام آزاد سے مل گیا۔ چنانچہ انہوں نے مولانا آزاد کو ان کی زندگی ہی میں مرحوم قرار دے کر ان کی جگہ خود سنبھالی' ان کی وضع کردہ اصطلاح حکومت الٰہیہ کو اپنا نصب العین بنایا (جس کی مزید تشریح خیری برادران کر چکے تھے) ان کی حزب اللہ کے نقشے پر اپنی جماعت اسلامی قائم کر دی اور اپنی تحریک اسلامی' کو انہی خطوط پر شروع کر دیا جو مولانا آزاد نے متعین کئے تھے لیکن جن پر وہ اپنی بعض کمزوریوں یا کچھ موانع کے باعث آگے نہ چل سکے تھے' یہی وجہ ہے کہ مولانا مودودی اگرچہ ایک بہت بڑے

[ا] اس معاملے میں مودودی صاحب جتنے پختہ واقع ہوئے ہیں اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے (ا) نہ تو کبھی نیاز فتح پوری سے حاصل کردہ انشاء پردازی کی بنیادی تربیت کا ذکر فرمایا' (ii) نہ ابوالکلام مرحوم اور خیری برادران سے اخذ کردہ تصوّر حکومتِ الٰہیہ پر ان حضرات کا کبھی ذکر خیر کیا (iii) اور نہ ہی علامہ اقبالؒ کا یہ احسان کبھی علانیہ تسلیم کیا کہ انہوں نے انہیں حیدر آباد دکن ایسی سنگلاخ جگہ سے جہاں بقول خود ان کے کوئی ان سے یہ بھی نہ پوچھتا تھا کہ "تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں" ! پنجاب کی اس سرزمین میں پہنچایا جو ہر تحریک اور نئی دعوت حتیٰ کہ دعویٰ نبوت تک کے لئے نہایت زرخیز و ساز گار ہے۔ .... حتیٰ کہ جب علامہ اقبال کا انتقال ہوا اور ملک بھر میں صفِ ماتم بچھ گئی تب بھی مدیر' ترجمان القرآن نے کوئی کلمۂ خیر......... یا کلمۂ تعزیت اپنے موقر جریدے میں شائع نہ فرمایا۔ اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی راوی ہیں کہ جب خود انہوں نے اس معاملے میں مودودی صاحب سے استفسار کیا تو انہوں نے جواب میں ارشاد فرمایا "میں اس وقت حالتِ جہاد میں ہوں اور میدانِ قتال میں مردے دفن کرنے کی فرصت کب ہوتی ہے" ۔ چشتی صاحب فرماتے ہیں کہ بعد میں جب میں نے یہ دیکھا کہ مودودی صاحب کے حلقے کے جرائد نے مولانا مسعود عالم صاحب ندوی اور چودھری علی احمد مرحوم کی وفات پر خاص نمبر تک نکالے اور کتابیں شائع کیں تو میں حیران رہ گیا ؏

"کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں!"

مصنّف اور مؤلف ہیں اور بسیار نویسی میں ان کے مد مقابل صرف دو غلام احمد ہی ہیں[1]۔ تاہم دین ومذہب کے میدان میں ان کا اصل مقام ابوالکلام مرحوم ہی کی طرح داعی کا ہے نہ کہ مفکر کا.......... بایں ہمہ چونکہ ان کا وسیع و عریض لٹریچر برصغیر کے طول و عرض میں بھی پھیلا ہے اور مشرق وسطیٰ میں بھی لہٰذا ملت اسلامیہ کی جدید مذہبی فکر کے اس جائزے میں ان کا تذکرہ بھی ناگزیر ہے۔ !

مودودی صاحب خود بھی اس امر کے مدعی ہیں اور ان کے بارے میں عام طور پر یہ خیال بھی پایا جاتا ہے کہ وہ "بیچ کی راس" کے آدمی ہیں یعنی انہوں نے علی گڑھ کی پیدا کردہ متجددانہ ذہنیت اور دیوبند کے قدامت پرستانہ مزاج کے مابین ایک درمیانی راہ پیدا کی ہے اور گویا قدیم و جدید کو بہم کر دیا ہے ان کا دعویٰ اس اعتبار سے وزنی ہے کہ ان کی دینی دعوت اور ان کا مذہبی فکر دونوں زیادہ تر جدید تعلیم یافتہ طبقے میں پھیلے ہیں اور نہ صرف ملّتِ اسلامیہ ہندو پاک بلکہ مشرقی وسطی کے بعض ممالک کی نوجوان نسل کا بھی ایک خاصہ قابل ذکر حصہ ان کے زیر اثر ہے.......... ان کے خود بیچ کی راس' کے آدمی ہونے کا یہی ثمرہ تھا کہ ابتداء برصغیر کے تمام درمیانی مکاتب فکر کے علمبرداران کی جانب کھنچ آئے[2] چنانچہ جیسا کہ عرض کیا جاچکا' ایک جانب مولانا فراہیؒ کے جانشین مولانا اصلاحی اپنے تمام کام چھوڑ چھاڑ کر ان کے پاس آ گئے۔ دوسری طرف مولانا سید سلیمان ندویؒ کے دونوں اہم شاگرد یعنی مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بھی ان کے گرد جمع ہو گئے.......... پھر یہ بھی ان کے علی گڑھ اور دیوبند کے مابین کی شخصیت ہونے کا نتیجہ تھا کہ ایک جانب حلقہ دیوبند سے ایک بے تاب روح' مولانا محمد منظور نعمانی کی صورت میں ان کی طرف کھنچ آئی اور دوسری

---

[1] یعنی ایک آنجہانی غلام احمد قادیانی اور دوسرے ایں جہانی غلام احمد پرویز!

[2] یہ ایک دلچسپ امر ہے کہ سکہ بند مذہبی حلقوں میں سے مولانا مودودی کی طرف صرف اس طبقہ اہل حدیث کے لوگ آئے جو ایک تو غیر مقلد ہونے کے باعث ویسے ہی 'آزاد' ہوتے ہیں' دوسرے یہ واقعہ ہے کہ اس طبقے میں خدمت و نصرتِ دین کا داعیہ ہمیشہ سے اتنا شدید رہا ہے کہ یہ ہر نئی دعوت پر اس امید میں والہانہ لپکتے ہیں کہ شاید اسی کے ذریعے اسلام کی 'غربت' ختم ہو جائے اور وہ خدا کے یہاں اسلام کے اس دور غربت میں اس کے ہمدرد و مونس و غمخوار شمار ہو جائیں!

طرف سلسلہ سرسید سے بھی مولانا عبدالجبار غازی (پرنسپل اینگلو عربک ہائی سکول دہلی) ایسے لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے........ یہ دوسری بات ہے کہ مولانا مودودی اس شیرازے کو مجتمع نہ رکھ سکے اور کوئی جلد اور کوئی بدیر بدظن یا غیر مطمئن ہو کر ان سے کٹ گیا........ تاہم چونکہ ان میں تنظیمی صلاحیت اور محنت اور مستقل مزاجی کے ساتھ کام کرنے کا مادّہ ابتدا ہی سے موجود تھا' وہ اس ساری آمدورفت' کے علی الرغم ایک مذہبی فرقے کی حد تک لوگ کالجوں اور یونیورسٹیوں اور مدرسوں اور دارالعلوموں دونوں سے ہی فارغ التحصیل شامل ہیں۔

مولانا مودودی کی تحریک اسلامی کہاں اور کس مؤقف سے شروع ہوئی اور پھر وہ کن کن مراحل سے گزر کر بالآخر کہاں پہنچی اور اب "عشق بلاخیز" کا یہ "قافلہ سخت جان" کس وادی اور کس منزل میں ہے یہ ایک علیحدہ مستقل موضوع ہے جس پر ہم نے اپنی کتاب "تحریک جماعت اسلامی ایک تحقیقی مطالعہ" میں مفصل بحث کی ہے یہاں اصل گفتگو ان کی تحریک سے نہیں بلکہ ان کے 'فکر' سے ہے........ اگرچہ یہاں اس اعتراف کا اعادہ کئے بغیر گزرا نہیں جارہا کہ راقم الحروف نے خود بھی شعور کی آنکھ اسی تحریک کی گود میں کھولی اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے کچھ کرنے کا جذبہ اسی کے طفیل پایا۔

فکر........ کے میدان میں مولانا مودودی نے ابتداء ہی سے یہ حکمت عملی برتی کہ فلسفہ اور علمِ کلام کے مشکل موضوعات سے کامل اجتناب کیا۔ حتیٰ کہ عقائد کے باب میں بھی ہمیشہ نہایت اجمال واختصار کے ساتھ بات کی۔ اور جتنی کی اس میں بھی زیادہ تر ان اعتقادات کو بیان (NARRATE) کرنے پر اکتفا کیا جو امت کے سواد اعظم کے یہاں معروف ومقبول ہیں۔ چنانچہ انہوں نے نہ تو الٰہیات ومابعد الطبعیات سے بحث کی' نہ جدید فلسفیانہ رجحانات سے تعرض کیا حتیٰ کہ ان گمراہ کن نظریات سے بھی براہ راست بحث و گفتگو سے احتراز کیا جو جدید سائنس کے مختلف شعبوں سے ابھرے ہیں[1]........ گویا کہ علمِ کلام کی اصل سنگلاخ وادی میں انہوں سرے سے قدم ہی نہیں رکھا

---

[1] ان نظریات مثلاً (ڈارون کا نظریہ ارتقاء) پر مولانا کی تنقید زیادہ سے زیادہ کچھ پھبتیاں کسنے تک محدود ہے اور وہ بھی صرف رسائل ومسائل" ایسی کتابوں میں۔

اس کے برعکس انہوں نے 'عمرانیاتِ اسلام' کو اپنا اصل موضوع بنایا۔ اور عمرانیات کے مختلف شعبوں یعنی تمدّن و اخلاق معاشرت و معیشت اور ریاست و سیاست کے باب میں جدید نظریات جن اصطلاحات میں اور جس اسلوب و انداز سے مرتب و مدّون ہوئے ہیں انہی کو استعمال کر کے انہوں نے 'اسلامی نظامِ زندگی' کا ایک مربوط و منضبط تصوّر پیش کرنے کی کوشش کی، جس میں وہ بلاشبہ بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ اس اعتبار سے انہیں زیادہ سے زیادہ ایک عمرانی مفکر (SOCIAL THINKER) قرار دیا جاسکتا ہے گویا کہ ان کی اوّلین نمایاں ترین اور بنیادی و اساسی حیثیت تو داعی کی ہے (اور اس پہلو سے وہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی شخصیت کا معنوی تسلسل ہیں) ثانوی حیثیت میں انہیں اسلام کا ایک جدید عمرانی مفکّر بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

متذکرہ بالا حکمتِ عملی سے مودودی صاحب کو فائدے بھی بہت سے پہنچے مثلاً ایک[1] یہی کہ اعتقادی و کلامی بحثوں سے احتراز کی بناء پر ایک طویل عرصے تک وہ مذہبی طبقات کی مخالفت سے بچے رہے۔ اور اس میدان میں قدم رکھتے ہی تکفیر و تفسیق کے جن فتووں کا سامنا ناگزیر ہوتا ہے ان سے محفوظ رہے........... دوسرے[2] یہ کہ ان کا یہ اوسط درجے کا فکر قوم کے درمیانی و متوسط طبقے میں تیزی کے ساتھ پھیلا اور سکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں سے تعلیم یافتہ بہت سے نوجوان "اسلامی نظامِ حیات" کے اس تصوّر کو قبول کر کے اس کے 'قیام' کی عملی جدوجہد کے لئے آمادہ ہو گئے........... گویا ان کی تحریک اسلامی کے لئے راہ ہموار ہو گئی........... لیکن اس کے بہت سے مضر عواقب بھی ظاہر ہوئے۔ مثلاً سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ مذہب کا اعتقادی و تعبدی پہلو بالکل دب کر رہ گیا اور اسلام کی بس یہی ایک حیثیت نگاہوں کے سامنے رہ گئی کہ وہ ایک نظام زندگی ہے۔ پھر چونکہ عمرانیات کے مختلف شعبوں میں سے بھی مودودی صاحب کا اصل میدان "سیاسیات" کا ہے اور اسلام کے نظامِ زندگی میں بھی ان کی اصل نگاہ اس کے نظریہ ریاست و سیاست پر ہے لہٰذا پورے دین و مذہب

---

[1] اس موضوع پر اختصار کے ساتھ راقم نے اپنی تحریر "اسلام کی نشاۃ ثانیہ" میں بحث کی ہے اور تفصیل کے ساتھ ہندوستان کی جماعت اسلامی کے ایک سابق رکن (بلکہ رکن شوریٰ) وحید الدین صاحب نے "تعبیر کی غلطی" نامی کتاب میں بحث کی ہے۔